© rasailojaraid.com

بنتِ امیرِ شریعت سیدہ ام کفیل

تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے۔

اگر مہرِ نیم روز کے سامنے مٹی کا دیا جلا کر سورج کی روشنی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے یا شب ماہتاب میں شمع جلا کر رات کی تاریکی کم کی جاسکتی ہے یا نسیم سحر کے روح پرور اور جاں فزا جھونکوں کے روبرو دستی پنکھے ہواؤں کو روح میں اتار سکتے ہیں تو پھر میرے اباجی کی شخصیت کا حسن ووقار الفاظ سے اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ اولاد ہونے کے ناطے سے اباجی ہمارے لئے دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت تھے۔ اور ہمارے لئے تو۔ ع

پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز ہمارے لئے تو اصول زیست تھے اور ہیں۔ انکی قدر و منزلت۔ تو ان کور بصر اپنوں، بیگانوں سے پوچھی جائے کہ جنہوں نے ان سے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا بلکہ مخالفت کی پستیوں میں اترتے چلے گئے۔ الزام و دشنام کا کون سا گوشہ ہے جو مسلمان کہلانے والوں نے کفار و مشرکین کے ہم نوا ہو کر نہ بسایا کہ ہر سو شرافت دم توڑ گئی اور حیاء سرنگوں ہوگئی۔

پھر حالات کو ان کے پیش کردہ خدشات کے مطابق ڈھلتے دیکھا تو یہ غدار کہنے اور گالیاں دینے والے روتے ہوئے ان کی چوکھٹ پر آئے اور انہوں نے گلے لگاتے ہوئے وہی سلوک کیا جو ایک باپ بے وقوف اولاد کے نادم ہونے پر کرتا ہے۔

جب بھی وہ یاد آتے ہیں تو ذہن میں ایک طوفان برپا ہو جاتا اور سمجھ نہیں آتا کہ اگر ان یادوں کو قلم بند کروں تو کہاں سے شروع کروں۔ میرے بچے جب ان کی باتیں سنتے تو باصرار ان کی فرمائش ہوتی کہ اپنی یادداشتیں قلم بند کردیں۔ مگر پہلے گھر کے کام اور بچوں کی نگہداشت سے فرصت نہ ملتی۔ بچیوں نے گھر کا کام سنبھال لیا تو اپنی صحت جواب دے گئی۔ نور العیون، کفیل احمد اور محمد ذوالکفل سلمہما کا دھیما دھیما اصرار کئی دن سے جاری ہے اور میں عجوزۂ مصر کی طرح سوت کی انٹی لے کر خریداری کا ارادہ اس لئے باندھ رہی ہوں کہ وہ جس کی نگاہ برق اور چہرہ آفتاب تھا۔ وہ مجھ پر محبتوں کی بارش برسانے والا میرا باپ تھا۔ محبت صرفی نحوی قواعد سے آزاد ہوتی ہے۔ بس مجھے جو جہاں یاد آتا جائے گا لکھتی رہوں گی۔

مجھے اپنے بچپن کا سب سے پہلا واقعہ جو یاد آتا ہے وہ چار برس کی عمر کا ہے۔ امرتسر میں ہمارا مکان گلوالی دروازہ کے اندر تکیہ بابا ستار شاہ سے ورے اور مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم کے گھر کے سامنے تھا۔ ہمارے گھر کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا اور گھر کی جنوب مشرقی سمت کی کھڑکیاں بھی سڑک پر کھلتی تھیں۔ محلے کی سڑک تھی شاہراہ نہ تھی۔ ٹریفک کی کمی کی وجہ سے بچے سڑک کے اس پار سے اس پار آسانی سے آجا سکتے تھے۔

سڑک پر خوانچے والے پے در پے گزرتے اور گزرتے بھی صدائیں لگاتے ہوئے تو کسی وقت ایمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"متزلزل" ہو ہی جاتا!

ایک دن بیر بیچنے والے کی آواز کان پڑی تو میں نے (۱) اماں جی سے ایک پیسہ مانگا جو مل گیا اور میں "بانو" کے ہمراہ دروازہ پر پہنچی تو بیر والا پچھواڑے میں "گور کنڈوں" کی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ ہم نے اس سے بیر لئے اور گلی میں بانو مجھے اپنے مکان میں لے گئی۔ وہاں کچھ دیر ہو گئی ادھر میری تلاش شروع ہو گئی۔ ڈھونڈنے والا یاد نہیں کون تھا۔ بہر حال وہ "بانو" کے مکان تک پہنچ گیا اور ہمیں لے کر گھر آ گیا۔ اباجی اس تاخیر پر پریشان تھے۔ انہوں نے اظہار ناراضی اور تنبیہ کے لئے ایک ہلکا سا طمانچہ میری گال پر سجا دیا۔ میرے لئے تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں جو اونچی آواز سے ڈانٹ سننے کی عادی نہ تھی رخسار پر طمانچہ کھا کے پھوٹ پھوٹ کر روئی اور روتے روتے وہیں اباجی کے پاس ہی سو گئی۔

اس واقعہ کو نصف صدی بیت چکی ہے اور مجھے خوب یاد ہے کہ جس وجہ سے میری آنکھ کھلی وہ یہ تھی کہ میرے اباجی میرے گال اسی جگہ سے چوم رہے تھے جہاں انہوں نے طمانچہ مارا تھا۔

ہمارے گھر میں ۱۹۳۸ء تک (۳۸ء میں بھائی عطاء المحسن سلمہ کی ولادت ہوئی) میرے اور بھائی جان (سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ) کے علاوہ ایک شخصیت اور تھی جو سن شعور کو پہنچنے تک ہمارے ہاں بطور فرد خانہ مقیم رہی اور وہ تھی "بانو" بانو محلہ کے ایک غریب کشمیری خاندان کی لڑکی تھی کسی استاد کے قابو نہ آتی تھی۔ اس کی والدہ اماں جی کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بٹھا گئی۔ مجھے بانو کی آمد کا سماں آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہمسایوں کے لڑکے بانو کے ہاتھ پاؤں پکڑے اس کا "ڈولی ڈنگا" بنا کر اٹھائے ہوئے لے آئے اور بانو بھی ہاتھ پاؤں مارتی چلاتی ہوئی اپنا آپ ان ظالموں سے چھڑانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔ اور پھر یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا کہ محلے کے ہمسایہ بچوں کی دستی زنجیر میں جکڑی ہوئی بانو تڑپتی پھڑکتی ہمارے ہاں پہنچائی جا رہی ہے۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بانو ہم بھائی بہنوں کے ساتھ یوں گھل مل اور رچ بس گئی گویا بانو میری بہن ہے۔ بانو کے اس انقلاب میں میرے اباجی کے روح میں اتر جانے والے پیار کا بہت زیادہ حصہ تھا۔ اگرچہ اماں جی نے بھی اس سے کم محبت نہیں کی تھی مگر اماں جی اس کی معلمہ تھیں اس ناطے کبھی کبھار "مرمت" بھی ہو جاتی لیکن بانو اباجی کی مودت و رأفت سے اس گھر کے ایک فرد کی صورت میں ڈھل گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماہ و سال یوں گزر گئے کہ مجھ میں اور بانو میں جدائی کا تصور بھی کبھی نہ ابھرا تھا کہ اچانک بانو کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ بانو شادی کی رسموں کے لئے ماں باپ کے گھر نہیں جاتی بلکہ اس کا اصرار یہ ہے کہ یہ رسمیں بھی ہمارے ہی گھر میں ادا ہوں گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ کیا ہوا جو بانو مہینے میں کبھی کبھار اپنے ماں باپ کے گھر بھی ہو آئے۔ پھر وہ دن بیٹیوں کی رخصتی کی تاریخ میں انوکھا دن تھا کہ ادھر دولہا کی بارات آئی ہوئی ہے ادھر بانو دلہن بنی ہمارے گھر اور ایک ایک کے گلے لگ کے رو رہی ہے اور چیخ کر اماں جی کے گلے میں بانہیں ڈالے چلا چلا کر ایک بات کہے جا رہی ہے "بیوی جی اج میں تہانوں کیوں نئیں چنگی لگدی اج مینوں کیوں گھروں کڈن لگے او۔ اج تسی مینوں کیوں اپنے کول نہیں رکھدے" بی بی جی آج میں آپ کو کیوں اچھی نہیں لگتی آج مجھے کیوں گھر سے نکالنے لگے ہو۔ آج آپ مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیوں اپنے نہیں رکھتے۔

ہمارے گھر میں کہرام بپا ہے۔ اباجی اور ہم سب اشکبار ہیں روتے روتے ہماری ہچکیاں بندھ گئیں بڑی منتوں اور سماجتوں سے بانو اپنے میکے سے نہیں ہمارے گھر سے سید عطاء اللہ کی محبتوں کے گہوارے سے سسرال جارہی تھی یہ اس دور کی بات ہے جب بیٹیاں میکے چھوڑتے رویا ہی کرتی تھیں۔ ہماری بانو جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اس کی محبتوں کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے۔ روحِ وفا، جانِ اخلاص بانو! تیری تربت پہ اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو۔

بانو! اے کاش تو اب سن سکے کہ دنیا نے شرم و حیا، اخلاص و وفا، غیرت و حمیت اور محبت و پیار کی وہ تمام روشیں پامال کر دی ہیں۔ بانو! وہ چمن اس ظالم و سفاک مغربی تہذیب و معاشرت نے اجاڑ کے رکھ دیا ہے۔ اے کاش! حوازادیاں شرافت کے وہ رات دن پھر واپس لے آئیں۔

مسوری ہندوستان میں ایک بہت صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ اماں جی کا بخار ایک دفعہ بگڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے ٹی۔ بی کا شک ڈال دیا اور بحالی صحت کے لئے معالجوں کے مشورہ سے چار برس موسم گرما میں اباجی ہمیں وہاں لے جاتے رہے۔ خود پورے ہندوستان میں تبلیغی دوروں پر بھی جاتے تھے اور ہمارے پاس بھی کچھ وقت گزار آتے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہم لوگ ترک سکونت کر کے ملتان آئے۔ یہاں ایک بار فرمانے لگے کہ "میں نے ساری زندگی میں تمہیں ایک بار طمانچہ مارا تھا۔ مسوری میں تو زمین پر لیٹی ہوئی تھی اٹھتی نہ تھی"۔ میں کہہ بیٹھی کہ نہیں اباجی ایک تھپڑ اور بھی ہے اور بیر خریدنے کا قصہ سنایا۔ انکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فرمانے لگے۔ "مجھے معاف کر دو! تم نے اب تک یاد رکھا ہوا ہے"؟ میں نے عرض کیا نہیں جی کبھی پٹتی جو نہ تھی اس لئے یاد رہ گیا ہے عمداً تو یاد نہیں رکھا! اللہ کی رحمتیں بارش کی طرح ان کے مرقد پر برسیں!

مسوری ہی کا ایک اور واقعہ چند دفعہ انہوں نے دہرایا اور ہر بار آبدیدہ ہو جاتے۔ ہوا یوں کہ ایک دن سیر کے لئے نکلے تو مجھے گود میں لیا ہوا تھا۔ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہوئے پاؤں پھسل گیا۔ اباجی منہ کے بل گرے مگر مجھے بچانے کی کوشش کی میں گری تو سہی لیکن صرف ان کے ہاتھ کا بوجھ مجھ پر آیا فرماتے تم نے اٹھ کر یہ نہیں کہا کہ مجھے چوٹ لگی بلکہ ماں کو شاگردوں کی پیروی میں کہا! "بیوی جی شاہ جی ڈگ پئے شاہ جی نوں سٹ لگی اے" (بی بی جی شاہ جی گر گئے، شاہ جی کو چوٹ لگی ہے) بیٹی تھی نا! گھر میں ان کا آنا سب کے لئے خوشی کا باعث ہوتا مگر مجھے تو ایسی ہی خوشی ہوتی تھی جیسی بچپن میں عید کی! وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتے تھے۔ اسٹیشن سے گلوالی دروازہ آتے ہوئے ہال بازار سے موسم کا عمدہ پھل خرید کر آتے۔ اچھے سے اچھے کھانے کھلاتے اور یوں بھی ان کے طفیل اللہ کی نعمتیں گھر کا احاطہ کئے رہتیں مگر جو چیزیں ان کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھیں۔ ہمارے حق میں بالخصوص اور متعلقین کے لئے بالعموم وہ تھیں جھوٹ اور چوری۔ بڑے سے بڑا نقصان سچ بولنے پر معاف فرما دیتے تھے۔ سزا نہیں دیتے تھے بلکہ سمجھاتے تھے۔ امرتسر کا مکان مختصر مگر بڑے قرینے کا پختہ بنا ہوا تھا جو اباجی نے اپنے استادزادے اور ہم سبق حضرت مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم و مغفور سے خریدا تھا۔ حضرت مفتی غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی رحمہ اللہ کے مرید مستریوں نے بڑی عقیدت سے بنایا ہوا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا مرحوم نے وہ اباجی کے ہاتھ بیچ دیا اور بالکل سامنے اور بنا لیا۔ ۴۷ء تک ہم لوگ آمنے سامنے رہے۔ بیٹھک، صحن اور دونوں ڈیوڑھیوں میں سیاہ و سفید ٹائلوں کا فرش تھا۔ بچپن میں چینی کا کوئی برتن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو کرچی کرچی ہو جاتا۔ اماں جی ہلکی سی سرزنش کرتیں۔ جب کبھی اماں جی چھت پر ہوتیں اور میں نیچے برتن توڑ لیتی تو پھر دل سے بے اختیار اباجی کی آمد کی "پرخلوص" دعائیں نکلتیں کیونکہ سچ بولنے پر ایک تھپڑ بھی نہیں پڑتا تھا صرف احتیاط سے اٹھانے کا کہتے تھے۔ ویسے بچپن میں مجھ سے برتن ٹوٹے بھی بہت! ایک دن مولانا بہاء الحق صاحب کی ایک لڑکی سے کھیلتے کھیلتے لڑائی ہو گئی۔ وہ برا بھلا کہہ کر گھر چلی گئی۔ چھت پر کھیل رہے تھے۔ مجھے اپنے غصہ کے فرو کرنے کی یہ صورت نظر آئی کہ سلیٹی سے دیوار پر اس کا نام لکھ کر آگے کوئی نازیبا لفظ لکھ دیا کچھ دیر بعد اباجی چھت پر گئے اور وہ لفظ انہوں نے لکھا دیکھ لیا۔ نیچے آئے اور مجھے آواز دے کر بیٹھک میں بلایا۔ پاس بٹھا کر آرام سے پوچھا کہ اوپر دیوار پر فلاں لفظ تم نے لکھا ہے؟ مارے ندامت اور خوف کے میرا خون خشک ہونے لگا اور قوت گویائی جواب دینے لگی۔ مجھے علم تھا کہ وہ ماریں گے نہیں۔ مگر جب کسی غلطی پر وہ فرماتے بٹیا یہ حرکت تم نے کی؟ تو جی چاہتا زمین پھٹ جائے اور میں روپوش ہو جاؤں۔ محض اس شرمندگی سے بچنے کے لئے میں نے جھوٹ بولا کہ نہیں جی میں نے نہیں لکھا بچپنے میں اتنا سوچنے کی ہوش کسے تھی کہ وہ تو ماتھے پڑھ لیتے ہیں۔ انہوں نے مارا نہ برا لفظ کہا دو تین دفعہ وقفے وقفے سے جب پوچھا کہ کیا تم نے نہیں لکھا تو محسوس ہو گیا کہ سچ بولنے کے علاوہ نجات کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے مان لیا کہ ہماری لڑائی ہوئی تھی اور میں نے ہی لکھا ہے۔ فرمانے لگے تو جھوٹ کیوں بولا؟ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولنا جاؤ اور جا کر دیوار سے وہ لفظ مٹا دو۔ یہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے سلسلہ میں معمولی باتوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ یہ آٹھ نو برس کی عمر کی بات ہو گی۔ ایک دفعہ وہ بہت دنوں کے لئے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ وہ بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے اور گرمی کے موسم میں گھر میں زیادہ پیاس کے وقت کسی بادیے یا بڑے برتن سے پیتے تھے۔ میں نے وہی برتن اٹھایا اور اس سے اباجی کی طرح ہی منہ لگا کر پانی پیا۔ جب اباجی واپس آئے اور حسب معمول کھانا کھاتے وقت مجھے ساتھ بٹھا لیا تو میں نے کہا اباجی میرا دل آپ کے لئے بہت اداس تھا تو میں نے اس برتن سے ویسے ہی منہ لگا کر پانی پیا تھا جیسے آپ پیتے ہیں "اباجی ایہہ وی تے اک طراں دی یاد ای اے نا؟" (یہ بھی تو ایک طرح کی یاد ہی ہے نا؟) یہ بات ان کے دل کو لگی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے دہلی آیا تو دیگر جماعتوں کی طرح احرار کے رہنما بھی اباجی سمیت مہینہ کے قریب دہلی رہے۔ ظاہر ہے میں یاد تو آتی ہوں گی۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم جب دہلی رہتے تھے۔ شیخ (حسام الدین) چچا جان اور اباجی کی انہوں نے دعوت کی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی انگریز بیگم کو سامنے لے آئے۔ انہوں نے بچوں کا پوچھا۔ تفصیل بتانے کے بعد یہ قصہ ڈاکٹر صاحب کو سنایا فرمانے لگے۔ ڈاکٹر متحیر سا ہو گیا دو تین دفعہ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ارے ارے۔ فرمانے لگے۔ ڈاکٹر کی بیوی پوچھنے لگی کہ بچے کتنے ہیں؟ میں نے کہا چار بیٹے اور ایک بیٹی وہ کہنے لگی آپ لوگ بیٹی کو حقیر سمجھتے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ پانچ بچے ہیں بلکہ یوں کہا کہ چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ میں نے کہا نہیں بابا یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات نہیں مجھے تو بیٹی بیٹوں سے زیادہ پیاری ہے۔ اور حقیقت بھی یوں ہی تھی مگر وہ تو جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا میرا پیچھا چھڑاؤ وہ مسکرا کر کہنے لگا باپ جانے اور بیٹی! میں تو دخل دیتا نہیں پھر فرمایا کہ ڈاکٹر تاثیر کہتا تھا انگریز عورتوں کو جب کوئی بیٹی کہے تو بہت خوش اور متاثر ہوتی ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا اباجی ہندوستان سے ایسا کون گیا ہے جس نے وہاں بیٹی بنائی ہو؟ جو گیا بیوی ہی بنا کر لایا ظاہر ہے بیٹی کہنے والے سے متاثر تو ہوں گی۔ اور اباجی تو گھر کی جمعدارنیوں تک کو امرتسر، ملتان میں بیٹی ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بچپن سے دیکھتے آئے کہ گھر میں آنے والی خواتین بیعت کے لئے آئیں یا ویسے کسی کام سے عمر کے مطابق اماں، بہن اور بیٹی کہہ کر مخاطب فرماتے۔ امرتسر میں ہماری جمعدارنی مسلمان تھی "خیراں" نام تھا اماں جی نے اس کو نماز یاد کرائی آدھا سپارہ اس نے پڑھا پھر اپنے کام کی مجبوری میں چھوڑ دیا۔ اس کی بھی ایک ہی بیٹی تھی کبھی کبھی وہ گھر آتی اور ہمارے ساتھ کھیلتی۔ ۴۵ء میں ہم لوگ کشمیر جانے لگے تو وہ کہنے لگی "شاہ جی! حمیدہ کہتی ہے میرے لئے کشمیر سے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک صندوقچی ضرور لائیں جس پر پھول لکڑی کو کھود کر بنائے جاتے ہیں" اباجی نے نہ صرف اس فرمائش کو یاد رکھا بلکہ خود جا کر سری نگر کی انار کلی "امیرا کدال" سے ایک خوبصورت صندوقچی خریدی اور امرتسر آ کر جمعدارنی کو دی۔ وہ مصائب میں گھبراتے نہیں تھے متوجہ الی اللہ ہو جاتے تھے۔ اپنی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے تھے مگر ہماری تکلیف ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ۴۷ء سے بے خانماں ہو کر ہم لوگ چھ ماہ لاہور پڑے رہے۔ کوئی ڈھنگ کا مکان ڈھونڈنا ان دنوں جوئے شیر لانا تھا۔ گوجرانوالہ کے کوئی عقیدت مند ایک دن آئے اور کہنے لگے۔ ہمارے محلہ میں ایک مکان ہے۔ اس کا سکھ مالک چابی ان صاحب کو غالباً دے گیا تھا آپ آ کر دیکھ لیں! بادل نخواستہ گئے اور دوپہر گوجرانوالہ کاٹ کر واپس لاہور آ گئے۔ ہم لوگ ان دنوں مجلس احرار اسلام کے ترجمان روزنامہ آزاد کے دفتر کی بالائی منزل پر ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن میں گزارا کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں چودھری افضل حق صاحب مرحوم کے کنبے کا سامان تھا اور چھٹیاں گزارنے جاتے ہوئے وہ لوگ یہ کمرہ ہمیں دے گئے تھے!

اباجی! گوجرانوالہ سے واپسی پر اوپر تشریف لائے اور اماں جی سے کہنے لگے۔ استغفر اللہ! دوپہر کانٹوں پر گزاری ہے میں چارپائی پر لیٹا نیچے نظر پڑی تو اس سکھ کے پیاز بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا میرا ان چیزوں پر کیا حق ہے؟ ہم لوگ اگست کے اواخر تک دفتر ہی کے کمرے میں پڑے رہے۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھتیں دوپہر کو بھائیوں اور اماں جی نے لیٹنا ہوتا تھا۔ میں دو کرسیاں آمنے سامنے بچھا کر ان پر لیٹ جاتی۔ آخر نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب نے اباجی کو اپنے ہاں (خان گڑھ) چلنے کی دعوت دی۔ فی الحقیقت ہمارے لئے اس وقت یہ پیش کش انتہائی قابل قدر تھی۔ نوابزادہ صاحب نے اپنی واحد حقیقی ہمشیر سے اپنا مکان فارغ کروا کر ہمیں دیا اور اپنے مردانہ بنگلہ کا آدھا حصہ ان کو رہائش کے قابل بنا دیا اور ان کے پورے خاندان نے ضروریات زندگی کے جمع کرنے میں ہر طرح سے مدد کی۔ امرتسر کے تیس پینتیس برس سے بستے گھر سے جو سامان لے آئے وہ ایک لحاف، ایک گدا، تین چار کھیس، ایک بوری برتن، مستعمل کپڑوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تین چار بکس اور سلائی مشین پر مشتمل تھا۔ یہ بھی اماں جی کی ہمت سے۔ جس دن امرتسر سے نکلے ہیں انہوں نے اباجی سے کہا جہاں بھی جا کر رہیں گے کیا کیا چیز کسی سے مانگیں گے۔ دفتر میں رہائش کے دنوں میں آغا شورش کاشمیری مرحوم و مغفور اور غازی محمد حسین صاحب مرحوم سالار اعظم جیوش احرار اسلام نے بارہا کہا کہ ہم ٹرک لے کر امرتسر جاتے ہیں۔ رضا کاروں کو ساتھ لے کر آپ کا سامان نکال لاتے ہیں۔ مگر اباجی نے فرمایا نہیں بھائی میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ عطاء اللہ شاہ نے اپنے سامان کے لئے لوگوں کے بچے مروادیئے کیونکہ ہندو سکھ جب کسی مسلمان کو اپنے محلے سے گزرتا دیکھتے تھے اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے بم گراتے تھے۔ ہمارے محلہ کے دولڑکے اباجی اور بھائی جان سے ملنے لاہور آنے لگے تانگہ ہال بازار میں پہنچا تو کسی طرف سے دستی بم گھوڑے پر گرا وہ پچھلی سیٹ سے چھلانگیں لگا کر کودے اور پیدل بھاگتے ہوئے اسٹیشن پر پہنچے۔ خانگڑھ کا قیام شروع میں ہمارے لئے بڑا عجیب تھا۔ رشتہ دار، وطن، ہمسائے سب چھوٹ گئے تھے۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آتا سوائے اباجی کے اور کسی کو زبان بھی سمجھ نہ آتی۔ کوئی لفظ اماں جی سمجھ لیتیں کہ ملتان بہاول پور سے کبھی کوئی مرید عورت ملنے امرتسر چلی جاتی تھی۔ آب و ہوا بھی ناموافق رہی۔ ایک سال کے قیام کے دوران اکثر اوقات سب بہن بھائی اور اباجی بخار میں مبتلا رہے۔ اباجی کو کچھ افاقہ ہوا تو بھائی عطاء المحسن شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دن اسے سرسام ہو گیا۔ ایسی کیفیت کبھی کسی کی نہ ہوئی تھی۔ اماں جی کے مثالی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے کہا اپنے اباجی کو بلاؤ میں نے دوڑ کر مردانے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اباجی نقاہت کی وجہ سے بمشکل چل کر آئے خان گڑھ میں تو ان دنوں معالج نام کی کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔ اچھرہ سے اباجی کے رفیقان جماعت جناب میاں قمرالدین، میاں محمد رفیق صاحبان مرحومین کے ایک عزیز حکیم خالق داد صاحب مرحوم آئے ہوئے تھے۔ ان کو بلایا وہ بے چارے فوراً ہی آ گئے اور ان کی تدبیروں سے گھنٹہ بھر بعد بھائی کو ہوش آیا اور آج وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ جب محسن بھائی نے آنکھیں کھولیں تو اباجی اینٹوں کے فرش پر سجدہ میں گر گئے۔ اور روتے ہوئے کہنے لگے مولا! میں اس آزمائش کا متحمل نہیں ہوں!

جس دن ہم لاہور سے خان گڑھ روانہ ہوئے تانگہ میں بھائی جان نے کوئی بات کی وہ تو میں نے نہیں سنی مگر اباجی کا جواب آج بھی یاد ہے کہ ''بیٹا کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے اور لعنت ہے اس سہارے پر جو ماسوا اللہ کے ہو''۔ خان گڑھ میں ہم ایک برس سے کچھ دن کم ہی رہے۔ جب حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ ملتان تشریف لے آئے اور مدرسہ کا دوبارہ اجراء ہو گیا تو انہوں نے بھائی جان کو بلوا لیا تھا اور پاکستان بننے کے بعد خیر المدارس سے جو پہلا گروپ فارغ التحصیل ہوا بھائی جان اسی میں شامل تھے۔ مگر چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ اباجی اس باب میں متفکر تھے اور ملتان میں اپنے احباب کو مکان کی تلاش کا کہہ رکھا تھا۔ ۵ فروری ۴۸ء کو ہماری سب سے چھوٹی اور سب کی چہیتی بہن سیدہ سالمہ بانو دو روزہ علالت کے بعد ہمیں داغ مفارقت دے گئی۔ اباجی اور ہم سب کے لئے غربت میں بڑا شدید صدمہ تھا۔ وہ گھر بھر کی رونق تھی۔ وہ بے چاری علی الصباح فوت ہوئی۔ اس افراتفری کے زمانہ میں ملتان سے خان گڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک ایک ہی لاری سارے دن میں چلتی تھی۔ اباجی نے اپنے ایک غریب لوہار مرید سے کہا کہ لاری پر جا کر ملتان سے حافظ کو لے آؤ وہ اڈے پر آئیا تو لاری نکل چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بہت بہت اجر مرحمت فرمائیں وہ بے چارا اپنے سائیکل پر ہی ملتان روانہ ہو گیا۔ اور سوءِ اتفاق کہ جب وہ بھائی جان سمیت روانہ ہوا تو ملتان سے بھی کوئی لاری نہ ملی اور وہ اللہ کا بندہ پھر سائیکل پر ہی بھائی جان کو لے کر خان گڑھ پہنچا تو رات کے ۹ بج چکے تھے۔ اباجی نے عصر تک انتظار کیا۔ خان گڑھ والوں نے اپنی محبت کا اظہار یوں کیا کہ پورے بازار کی دکانیں بند رہیں۔ عصر کے بعد اباجی فرمانے لگے کہ صبح سے لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر بیٹھے ہیں۔ کب تک یوں ہی انہیں بٹھائے رکھوں۔ حافظ کی قسمت میں منہ دیکھنا نہیں ہے۔ تدفین کر دیتے ہیں۔ اماں جی! بے چاری خاموش رہیں کہتیں بھی کیا اور اباجی اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اس کی آخری آرام گاہ تک لے گئے۔ وہ بے چاری کُل پونے دو برس زندہ رہی بھائی جان معصوم بہن کو آخری بار دیکھ سکنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اس کی وفات کے بعد دل اور اچاٹ ہو گیا۔ کسی کا بھی خان گڑھ میں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تینوں بھائی چھوٹے تھے۔ تعلیم کا وہاں کچھ بندوبست نہ تھا۔ پانی پت کے جناب قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر ہو کر وہاں آگئے تو عارضی طور پر بھائی ان سے حفظ کرنے لگے۔ اسی اثناء میں رمضان المبارک آگیا۔ بھائی جان! ملتان سے تعطیلات میں گھر آئے ہوئے تھے وہ قرآنِ کریم سنانے لگے۔ آخری عشرہ میں ایک دن ملتان سے جناب ملک عبدالغفور صاحب انوری رحمہ اللہ اور ملک عطاء اللہ صاحب یہ خوش خبری لے کر پہنچے کہ مکان ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ آکر دیکھ لیں۔ انہیں اباجی نے فرمایا کہ عید کے بعد آکر دیکھیں گے۔ چند ہی دن رمضان کے باقی تھے۔ وہ نماز فجر پڑھ کر ملتان واپس آگئے۔ دوپہر کو سب آرام کر رہے تھے۔ ظہر کا وقت ہوا تو ہمسائے نے پردہ کرنے کی تین آوازیں دیں جو ملتان کے علاقہ کا بڑا ہی شریفانہ اور اسلامی طریقہ ہے۔ دیکھا گیا تو وہ اپنے صحن میں آم کے درخت پر چارپائی باندھ رہا ہے۔ چھوٹا موٹا سامان رکھنے کے لئے۔ پوچھنے پر اس نے کہا سائیں دریائے چناب کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ پانی شہر کی طرف آرہا ہے۔ پریشانی میں ظہر پڑھی گئی۔ ہنڈیا چولھے پر رکھی تو لحہ بہ لحہ خبریں آنے لگیں۔ پانی شہر میں داخل ہو گیا "کھلاں کی بستی" ڈوب گئی۔ پانی ہسپتال تک آپہنچا۔ اتنے میں نواب صاحب کا پیغام آیا کہ بنگلے میں تشریف لے آئیں اور چند لمحے بعد سنا کہ بنگلے کی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ پھر ایک معتقد خواجہ عبدالرشید صاحب نے آکر کہا میرا چوبارہ ہے آپ کے لئے فارغ کر دیا ہے وہاں آجائیں اس کے منہ سے نکل گیا وہ اونچا ہے۔ اباجی نے فوراً اسے ٹوکا "یوں مت کہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے ایسے ہی کہا تھا۔ ویسے چلے چلتے ہیں"۔ پکتی ہنڈیا چولھے سے اتاری۔ افطاری کا وقت ہونے والا تھا کھانے کے برتن باسن لے کر خواجہ صاحب کے چوبارے پر دوبارہ پناہ گزیں ہو گئے۔ اباجی اور چند معتقد گھر رہے۔ ضروری چیزیں اٹھوائیں اور جس وقت بھائی جان تراویح پڑھا کر گھر آئے تو پانی بیرونی دیواریں گرا کر صحن میں آچکا تھا۔ کسی نے کہا "ھن تاں اٹھو کیا سوچیندے پئے او؟ (اب تو اٹھو کیا سوچ رہے ہو) تو اباجی بھی خواجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب کے ہاں آگئے۔ چھ روز ہم وہیں محصور رہے۔ قیامت کا سماں تھا۔ نچلی منزل میں صاحب خانہ ان کے اہل و عیال اور کنبے کے آفت زدہ افراد بھرے پڑے تھے اور اوپر ہم لوگ۔ ایک رات تو ایسی آئی کہ پانی اس بند سے بھی ٹکرانے لگا جو شہر کے بچے کھچے حصے پر باندھ کر لوگ پناہ لئے بیٹھے تھے۔ آدھی رات کے بعد لوگ گلیوں میں آوازیں دے کر آدمیوں کو اکٹھا کر رہے تھے تاکہ بند کو مضبوط بنایا جاسکے۔ اباجی جاگ رہے تھے۔ ہم ماں بیٹی سے فرمایا اٹھو! وضو کر کے مصلے پر آجاؤ (خود تو بیٹھے ہی تھے) مرنا ہی ہے تو اللہ کا نام لیتے ہوئے مریں۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ لوگوں کی محنت بار آور ہوئی اور بند ٹوٹنے سے بچ گیا۔ ملتان اطلاع پہنچ چکی تھی اور اباجی کے احباب مکان کا قبضہ لے کر راستے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چھے روز بعد پانی کچھ کم ہوا تو ہم لوگ تانگوں میں مظفر گڑھ روانہ ہوئے۔ حد نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ راستے میں دیکھا درخت جڑ سے نکل کر سڑک کے کنارے گرے پڑے تھے۔ دونوں تانگوں کے بم پکڑ کر چار آدمی ساتھ چل رہے تھے۔ مبادا سڑک ٹوٹی ہو اور پتہ نہ چلے! ہمارے کپڑے اور برقعے گھٹنوں تک پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو گھنٹوں میں دو میل کا سیلاب زدہ رقبہ طے ہوا اور ظہر کے قریب ہم مظفر گڑھ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ ایک زنانہ سکول کھلوا کر قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ رات وہاں گزاری اور دوسرے روز گاڑی میں ملتان روانہ ہوئے۔ لائن کئی جگہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گاڑی اس رفتار سے چل رہی تھی کہ چند بار دیکھا کچھ لوگ اترے اور پانچ منٹ بعد بھاگ کر پھر سوار ہوگئے۔ عصر کے بعد ملتان پہنچ سکے۔ اور تانگہ مدرسہ قاسم العلوم (کچہری روڈ) کے پاس پہنچا تو افطار کا وقت ہوگیا۔ سڑک ہی پر پانی سے روزے افطار کئے۔ اور پھر اس گھر میں داخل ہوئے جہاں سے اباجی کا جنازہ ہی اٹھا! مگر اس ساری مصیبت میں ایک لفظ انکی زبان سے شکوے کا نہیں سنا۔ استغفار ہی پڑھتے رہے۔ اباجی کبھی کسی کی برائی نہیں سوچتے تھے۔ انگریز اور مرزائی کے سوا۔۔۔ خاندان کا "بابو" طبقہ یوں مُلا سمجھ کر حقارت سے دیکھتا مگر کسی مفاد کے لئے ضرورت پڑتی تو شہرت سے فائدہ اٹھانے سے گریز نہ کرتا۔ کئی تذکرہ نگاروں نے ایک بھانجے کا قصہ لکھا ہے۔ بھانجا تو کوئی تھا ہی نہیں۔ رشتہ کی پھوپھی تھیں۔ ان کا لڑکا تھا۔ گھر میں کچھ سرزنش ہوئی تو بھاگ کر جبل پور چلا گیا اور فوج میں بھرتی ہوگیا۔ ماں فوت ہو چکی تھی۔ خالہ جنہوں نے پالا تھا روتی تھیں۔ برخودار ناز و نعم کے پلے ہوئے تھے۔ فوج کی مشقتوں نے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تو گھر والوں کو "مولوی صاحب" یاد آئے پھر ایک پوسٹ کارڈ اباجی کا جبل پور گیا اور ہفتہ کے اندر صاحبزادے ڈسچارج ہو کر گھر تشریف لے آئے کبھی قرابت داروں کے سلوک کا قصہ چھڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ خاموش رہتے۔ پھر فرماتے "خدا کے لئے اس تذکرہ بد کو ختم کر دو۔ گھر کی برکت اڑ جائے گی۔ تمہیں خدا نے کس چیز کی کمی دے رکھی ہے؟ بٹیا اپنا معاملہ خدا سے درست رکھو کبھی کسی کا برا نہ مانگو پھر دیکھو خدا کیا کرتا ہے"! اباجی خوددار تھے۔ شکر نعمت سے انکا دل لبریز تھا۔ غرور اور تکبر ان کے پاس سے نہ گزرا تھا۔ ہمارے داداجی مرحوم کے دو چچا اور ایک پھوپھی امرتسر میں آباد ہوئے۔ ان کی اولاد تقسیم تک وہیں آباد تھی۔ ان سب گھروں میں ایک کشمیری خاتون کام کاج کیا کرتی تھی۔ ہمارے بچپن میں وہ ضعیف العمر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی اور امرتسر میں پورے خاندان کے خورد و کلاں کی "ماسی" ایک دن اباجی "کٹڑہ رام گڑھ" سے گزر رہے تھے سامنے سے ماسی آ گئی۔ اباجی نے سلام کیا۔ وہ وہیں گلی میں بیٹھ کر اپنا حال سنانے لگی۔ اباجی وضع داری میں وہیں اس کی بات ختم ہونے تک کھڑے رہے ماسی بہت خوش ہوئی کہ شاہ جی نے میرا حال سنا۔ گھر آ کر یہ قصہ سنایا اور فرمایا کہ جب ماسی نے روکا تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یاد آ گئے انہوں نے بھی ام ایمن رضی اللہ عنہا کی باتیں ایسے ہی ایک دفعہ سنی تھیں۔ کسی کی بیٹی روٹھ کر میکے بیٹھ جاتی تو انہیں بہت دکھ ہوتا تھا۔ ملتان آئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ محلہ میں چند گھروں کے متعلق معلوم ہوا کہ انکی بیٹیاں روٹھی ہوئی ہیں۔ فریقین کو بلایا اور جب تک وہ لڑکیاں سسرال نہیں چلی گئیں انہیں چین نہیں آیا۔ ایک دو صاحب حیثیت مرید اپنی زکوٰۃ ان کی تحویل میں استعمال کے مکمل اختیار کے ساتھ دے دیتے تھے۔ اباجی نے محلہ ٹبی شیر خاں میں پانچ غریب لڑکیوں کا جہیز اس رقم سے تیار کرایا اور والدین کو بیٹیوں کی رخصتی میں مدد دی۔ ایک گھر میں نلکا لگوایا۔ محلہ کی مسجد بی بی عائشہ ٹوٹ رہی تھی اپنے احباب کی توجہ دلائی۔ خصوصاً حاجی دین محمد صاحب مرحوم کو جو مرید تو حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے تھے مگر اباجی سے بھی بہت محبت تھی۔ وہ لاہور سے تشریف لائے۔ اپنا پکاتے کھاتے اور پلے سے لگا کر مسجد مرمت کی مگر "بیماریٔ دل" میں مبتلا لوگوں نے ایک طرف تو کسی ملتانی پیر سے بکرے کی سری ٹونا کرا کر حاجی صاحب کی رہائش گاہ میں پھینکی اور ادھر متولی حضرات کے کانوں میں ڈالنا شروع کیا کہ شاہ جی کا ارادہ مسجد پر قبضہ کرنے کا ہے۔ حاجی صاحب اس قصہ سے بددل ہو گئے۔ حسبِ دل خواہ تو نہیں مگر بہرحال مسجد تعمیر کر کے واپس چلے گئے۔ اباجی کے کہنے پر بھائیوں نے چند بار رمضان میں وہاں قرآن پاک سنایا۔ اباجی نے مسجد کے ہمسایہ زمیندار سی تھوڑی سے زمین بھی خرید کر مسجد میں شامل کی۔ کھیتوں میں کچھ حضرات رفع حاجت کے لئے مسجد سے گزر کر جاتے تھے وہاں دیوار بنوا دی۔ کچھ لوگوں نے بڑی دل شکن باتیں کیں۔ بھائیوں کو طیش آیا تو فرمانے لگے۔ "میں نے جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا۔ ایک سید زادی کی بنوائی ہوئی مسجد تھی میں نے دیکھا ٹوٹ رہی ہے بنوا دی۔ تم نماز پڑھیں اور پڑھ لیا کرو جانا ہی چھوڑ دو"۔ بعض وقت سوچتی ہوں اباجی کیا تھے اور لوگوں نے کیا کہا؟ ہماری سب سے بڑی بہن پیدا ہوئی تو وہ میانوالی جیل میں تھے اسے دیکھا بھی نہیں وہ فوت ہو گئی مجھ سے بڑی بہن چار ماہ کی تھی تو وہ اپنے مشہور دورہ پر نکلے وہ سوا سال کی ہو کر رخصت ہو گئی اور اسے فوت ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے جب اباجی دیناج پور جیل سے رہا ہو کر تشریف لائے کیا یہ سب کسی دنیوی مفاد کے لئے تھا؟ انہوں نے جدوجہد آزادی میں جان کی بازی لگا کر حصہ لیا۔ آخری بیماری میں ملتان کے مشہور معالج ڈاکٹر خان دیکھنے آئے تو کہنے لگے۔ شاہ صاحب آپ کو خدا نے سو سال تک نہ گھلنے والا جسم دیا تھا جسے آپ نے تیس برس میں ختم کر دیا۔ تارا سنگھ نے خون کی ندیاں بہانے کی بڑک ماری تو جواب انہوں نے ہی دیا فرمایا "ایسا مت کہو میں نے اپنی توانائی صحیح مقصد پر صرف کی ہے" کشمیر اور کپور تھلہ کی غیر مسلم ریاستوں کے حکمرانوں کے ظلم کے خلاف تحریک انکی جماعت نے چلائی۔ راج پال کا فتنہ انہوں نے کچلا۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے ۲۱ء میں جب میانوالی جیل میں تھے کانگریس کا سربرآوردہ کارکن سردار منگل سنگھ ایم ایل اے بھی ساتھ تھا۔ اس سے دوستانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلقات تھے۔ نواکھالی یا بہار کے فسادات میں اس نے مسلمانوں کے قاتلوں کی پشت پناہی کی۔ ابا جی کو اطلاع مل گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہم لوگ دفتر احرار میں مقیم تھے تو ایک عقیدت مند فضل کریم سیٹھی صاحب چند دن کے نجی دورہ پر سرحد لے گئے۔ واپسی پر روداد سفر سناتے ہوئے فرمایا جب پشاور اسٹیشن پر اترے تو دیکھا منگل سنگھ دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ پاس آکر معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر میں نے ہاتھ نیچے کر کے کہا اب نہیں! میری قوم کو مروا کر مجھ سے معانقہ کرنے آئے ہو؟ اور قوم!!؟ امرتسر کا مکان برلب سڑک تھا بیٹھک کی کھڑکیوں پر چقیں پڑی رہتیں۔ ایک دن دیکھا دو شخص گزر رہے تھے ایک نے دوسرے سے پوچھا یہ کس کا مکان ہے؟ دوسرا اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ابا جی کی جسامت کی نشان دہی کرتے ہوئے بولا۔ عطاء اللہ شاہ کا۔ شہید گنج کا پیسہ لے کر بنایا ہے! حالانکہ یہ مکان مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم سے ۳۴۰۰ روپے میں اماں جی کا زیور بیچ کر اور قرض لے کر خریدا گیا تھا۔ ابا جی گھر میں ہوتے تو معمولی باتوں کا بھی دھیان رکھتے کبھی کبھی ہم بہن بھائیوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے "کبھی" اس لئے کہ ابھی سفر سے واپسی پر سامان رکھا جا رہا ہوتا اور ملاقاتی آن موجود ہوتے تھے مگر جب موقع ملتا تو پھر سمجھاتے بھی تھے۔ لقمہ چھوٹا لو، منہ میں پھراؤ مت، ایک طرف رکھ کر چبا، دستر خوان سے سالن والا ہاتھ نہ پونچھتے رہو؟ ہڈی پاس کسی برتن میں رکھو نیچے مت گراؤ؟ پھل کھا کر چھلکا زمین پر مت پھینکو۔ وہ گھر سے رخصت ہونے سے لے کر واپسی تک کی روداد سفر ہمیں سناتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم ابا جی کے ساتھ ہی تھے! یکے بعد دیگرے بھائی قرآن حفظ کرتے رہے۔ اور جب پہلی دفعہ کوئی تراویح میں پڑھتا تو انکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ کئی دفعہ ختم پر دیگ پکوا کر تقسیم کی۔ اچھے شعر سناتے تھے بلکہ یاد کراتے تھے۔ ایک روز میں نے کہیں پڑھا۔

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ایک روز شام کے وقت کمرے میں برتن نکال رہی تھی صحن میں لے جانے کے لئے تو پھر شعر یاد آیا پڑھنے کو جی چاہا اور میں نے اپنی یہ خواہش پوری کرلی۔ برتن لے کر مڑی تو دروازے پر ابا جی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں بہت نادم ہوئی ذرا اونچی آواز سے پڑھا تھا۔ فرمانے لگے کیا پڑھ رہی تھیں۔ پھر سنانا پڑا۔ فرمانے لگے بس ابا کی زندگی یہی ہے۔ بچپن میں ایک شعر سنایا تھا اب تک یاد ہے۔

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

بٹیا تو مجھے ساری عمر کہا مگر جب میری پہلی بچی باتیں کرنا سیکھنے لگی تو "بٹیا جی" کہنا شروع کر دیا۔ ان کے منہ سے اپنا اتنا ادب مجھے بہت محجوب کرتا آخر ایک دن کہا کہ ابا جی اب آپ مجھے "جی" کہتے ہیں شرم آتی ہے۔ فرمانے لگے ننھی کے لیے کہتا ہوں تاکہ جی سنے اور جی کہے!

جنرل محمد ایوب خان کے زمانہ کی بات ہے۔ سکھ یاتری پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور زندہ دلان لاہور نے یوں استقبال کیا جیسے عزیز و اقارب سفر حج سے واپس آئے ہیں۔ ابا جی نے اخبار پڑھا اس روز عصر تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے اندر نہیں آئے۔ عصر کے وقت آئے اور خاموش خاموش صحن میں ٹہلنے لگے۔ اماں جی نے چائے کا پوچھا تو فرمانے لگے "صبح سے میرا خون کھول رہا ہے۔ قوم دیوث ہو گئی ہے اب کن کا استقبال کر رہے ہیں؟ ایک لاکھ جوان کٹوائے۔ ساٹھ ہزار بیٹی ہندو سکھوں کے قبضہ میں دی۔ فاطمہ اور عائشہ نام کی لڑکیوں کے بطن سے ہرنام سنگھ اور لچھمن سنگھ پیدا ہوئے اور اب پھر انہی کو بلا کر گلے مل رہے ہیں۔

اے کاش! آج میری صحت ہوتی تو لاہور میں تقریر کرتا۔ اور پوچھتا کہ کن دامادوں کو بلایا ہے" مرض الموت حقیقت میں سکھر جیل سے شروع ہو چکا تھا۔ جہاں بارہ آنے سیر کے چھیچھڑے گوشت کے نام پر پکائے جاتے۔ مسور کی دال اور گلے سڑے بینگن کھلائے جاتے۔ ایک بزرگ حج سے واپس آئے اور کہا مجھے مدینہ طیبہ میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہوا انہوں نے فرمایا عطاء اللہ شاہ کو میرا پیغام دینا کہ میری نبوت پر دشمن حملہ آور ہیں تم آرام سے مت بیٹھو (ان بزرگ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ واللہ اعلم) اس دن وہ بہت روئے اور بار بار فرمایا مجھے پیغام آیا ہے؟ پھر جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی انہوں نے اپنی پوری توانائیاں عصمت رسول اور ختم نبوت کے بیان میں صرف کیں۔ فالج کا پہلا حملہ ہونے سے چند روز قبل دانت نکلوائے یوں تو چاول شوگر کا علم ہونے پر چھوڑ دیئے تھے مجبوری کی بناء پر ان دنوں میں دو تین دن کھچڑی کھائی۔ زندگی کے آخری برسوں میں مغرب سے عشاء تک اوراد میں مشغول رہتے تھے۔ اور عشاء پڑھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اس روز وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ مولوی محمد علی صاحب جالندھری مرحوم آکر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد تک کسی مجلسی مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ اماں جی چولہے کے پاس بیٹھی تھک گئی تھیں۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئیں۔ میں بیٹھی رہی۔ کھچڑی ایسا کھانا ہے کہ پکنے کے بعد تیز آنچ پر نہیں رکھا جا سکتا۔ انگاروں پر دیگچی پڑی رہی۔ مولانا اٹھ کر گئے تو اباجی اندر آئے۔ برآمدے میں پلنگ پر بیٹھ کر کھایا کرتے تھے وہیں چولہے بنے ہوئے تھے۔ میں نے کھچڑی نکال کر دی تو نیم گرم بھی کھاتے کھاتے ٹھنڈی ہو گئی۔ کھاتے ہوئے دو دفعہ فرمایا آج میرے جسم میں ایک خاص کیفیت ہے پھر کلی کی اور بیٹھک میں چلے گئے۔ میری طبیعت میں تشویش سی پیدا ہوئی میں پھر جا کر بیٹھک میں دری پر بیٹھ گئی۔ فرمانے لگے پان کھا لو۔ جی نہیں چاہ رہا تھا محض ان کے کہنے کی بناء پر میں نے ایک ٹکڑا لگا کر منہ میں رکھ لیا۔ فرمانے لگے جاؤ آرام کرو۔ اگالدان صاف کر کے رکھا۔ ان کے الفاظ صحیح سمجھ نہیں آتے تھے مگر میں نے سمجھا کہ دانت نکلنے سے منہ متورم ہے اس لئے اس طرح بول رہے ہیں۔ علی الصباح وہ اٹھے تو انہیں محسوس ہو گیا کہ دایاں بازو صحیح کام نہیں کر رہا۔ مگر وضو کر کے مسجد سے باجماعت نماز پڑھ کر آئے اور مصلے پر اپنا کالا کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ معمول یہ تھا کہ مسجد جانے سے قبل برآمدے میں آکر السلام علیکم یا اهل البیت صبحکم اللہ بالخیر فرماتے اور بھائیوں کو نام لے لے کر آوازیں دیتے اور اٹھا جاتے اس روز اندر نہیں آئے۔ میں نماز پڑھ کر اپنے دونوں بچوں کو لے کر بیٹھک میں گئی۔ یہ بھی روز کا معمول تھا بچے اٹھتے ہی مچلتے تھے کہ نانا اباجی کے پاس چلیں۔ کپڑے پہنا کر لے جاتی۔ مصلے پر بیٹھے بیٹھے دونوں کو چومتے اور بچے سلام کر کے تھوڑی سی دیر بیٹھ کر آجاتے۔ پھر ناشتہ کے لئے اندر آتے تو ہاتھ اٹھا لیتے۔ اس روز میں نے جا کر سلام کیا تو پڑھتے ہوئے اشارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے سلام کا جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر بایاں ہاتھ دائیں پر پھیرا اور نفی میں سر ہلایا۔ ایک سیکنڈ میں میں سمجھ گئی وہ کیا کہہ رہے ہیں مگر میرا دل کہتا تھا اے کاش یہ نہ ہو۔ میں فوراً ہی واپس اندر گئی اور اماں جی سے رک رک کر کہا ابا جی کی طبیعت خراب ہے شاید ان کے بازو کو کچھ ہو گیا ہے۔ دو منٹ کے اندر اندر ہم ماں بیٹی پھر بیٹھک میں آ گئیں انہوں نے تسبیح مکمل کر کے بتایا کہ اٹھا ہوں اور نلکا چلانے لگا تو ہاتھ کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے جیسے تیسے وضو کیا اور کلمہ پڑھا

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَہٗ

اور پھر بھی زندہ رہا تو مسجد چلا گیا۔ اماں جی نے عرض کیا جب آپ نے محسوس کیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تو ہمیں کیوں آواز نہیں دی۔ اور پھر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا تو فرمایا کہ یہ سوچا جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے پریشان کیا کروں۔ اماں جی نے فوراً ہی چائے بنائی۔ دواء لسکٹ وغیرہ کھا کے چائے پی۔ دھوپ نکلی تو صحن میں بستر بچھا کر ہم لوگ ان کو بیٹھک میں سے لے آئے جناب حکیم عطاء اللہ خان صاحب مرحوم (جو ہمارے ہاں بڑے حکیم صاحب کہلاتے تھے) کو بلایا انہوں نے آ کر غذا وغیرہ قطعاً بند کر کے ماء العسل اور دیگر ادویہ دیں۔ یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور جوق در جوق لوگ عیادت کے لئے آنے لگے مجبوراً برآمدے کی چقیں گرا کر ہم اندر گئیں۔ اور ملاقاتی صحن میں ہی آ کر ملنے لگے۔ جماعت اسلامی کے باقر خان صاحب اور بابو سید نصیر احمد صاحب بھی آئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ضلع جالندھر کے فلاں گاؤں میں آپ گئے تھے اور میں نے وہاں آپ کو دیکھا تھا۔ اتنی تکلیف میں بھی اس وقت تک لقوہ کا اثر بھی چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا مسکرا کر فرمانے لگے "اوہ کیہڑی گلی جتھے بھا بھو نئیں کھلی" اور پھر بڑے مزے سے ان کو بتایا کہ دانت نکلوانے کی وجہ سے چند دن سے کھچڑی کھا رہا تھا اور رات کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی اپنی طرف سے یہی کسر باقی رکھی کہ گھڑے کا پانی نہیں پیا۔

بیماری کے ایام میں ایک دن صبح فرمانے لگے کہ آج ضعف بہت ہے چلا نہیں جاتا۔ پھر ناشتہ کیا (ناشتہ ہوتا کیا تھا؟ دو انڈوں کی زردی، دو تین بسکٹ اور دو پیالی چائے۔) پھر فرمانے لگے کہ چلتا ہوں ذرا حنیف اللہ تک! (حکیم عطاء اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند) میں نے عرض کیا ابا جی! ضعف ہے مت جائیے۔ فرمانے لگے ذرا دل بہل جاتا ہے۔ کلہاڑی ٹیکتے ہوئے دروازہ تک گئے تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں تو زنانہ دروازے کے سامنے پردہ کی جو دیوار بنی تھی اس کے پاس کھڑے ہیں۔ آواز دی۔ "بٹیا" میں جی کہہ کر بھاگتی ہوئی گئی تو دیکھا کپڑے مٹی سے بھر رہے ہیں۔ فرمایا بیٹا میں گر پڑا۔ میں ان کی حالت دیکھ کر رو پڑی۔ کپڑے جھاڑے۔ عرض کیا ابا جی میں نے تو کہا تھا آج نہ جائیے۔ فرمانے لگے۔ دروازہ کھولا ہی ہے کہ گر پڑا۔ پھر میرے بازو کا سہارا لے کر گھر کے برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ بار بار یہ کہتے رہے تم نے تو منع کیا تھا میں نے نہ مانا اور گر پڑا۔ میری ایک معمولی سے بات کا اتنا اثر۔ ان کی شفقت کی انتہا نہ تھی؟

لدھا رام والے کیس میں گرفتار ہونے سے چند روز قبل وہ مظفر گڑھ تشریف لے گئے۔ ایک روز صبح اماں جی چولہے کے پاس بیٹھی ناشتہ بنا رہی تھیں۔ میں اور بھائی جان پاس بیٹھے تھے کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دستک ہوئی اور ساتھ ہی آواز آئی "پھوپھی جی السلام علیکم" یہ بھائی عزیز الرحمن صاحب "لدھیانوی مرحوم و مغفور تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رح کے صاحب زادے وہ سب بہن بھائی اماں جی کو پھوپھی کہا کرتے تھے۔ اور پھر وہیں سے انہوں نے کہا شاہ جی گرفتار ہو گئے! اماں جی خاموش رہیں۔ انہوں نے بیٹھک میں بیٹھ کر ماموں جان اور بھائی کو تفصیلات بتائیں اور چلے گے غالباً تیسرے دن ابا جی کا مظفر گڑھ سے لکھا ہوا پوسٹ کارڈ بھی موصول ہو گیا مجھے بس اتنا یاد ہے اس میں گرفتاری کی اطلاع تھی۔ جب ابا جی گجرات منتقل ہو گئے تو بھائی جان اور ماموں جان ہر پیشی پر گجرات جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے ضد کی کہ ابا جی سے ملنے جانا ہے تو اس روز نہ تو ماموں جی مانے اور نہ بھائی جان۔ ان کے جانے کے بعد میں خوب روئی۔ اماں جی نے تو کبھی بھی جیل جا کر ملاقات نہیں کی مگر میری منتوں سے ان کا دل پسیج گیا اور اس سے اگلی پیشی پر انہوں نے ماموں جی کو آمادہ کر لیا اور وہ مجھے گجرات ساتھ لے گئے۔ اس وقت تو مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ ماموں جی نے مجھے ایک کھلی جگہ گھاس پر بٹھا دیا۔ برقعہ میں نے پہنا ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے بڑا ہجوم تھا لوگوں کا۔ کافی دیر بعد کہنے لگے آؤ چلو یاد آتا ہے ایک کمرہ تھا جس میں سرخ روغن ہو رہا تھا۔ ابا جی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں، ماموں جی، بھائی جان اور (۱) عاجز چچا مرحوم اندر داخل ہوئے۔ میں ابا جی سے لپٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ انہوں نے مجھے گود میں بٹھا لیا۔ پیار کیا اور کہا روؤمت کمرے کی کھڑکی میں سے ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگے وہ دیکھو کیسی اچھی جگہ ہے میں وہاں رہتا ہوں۔ بھائی جان نے پہلا محراب جب پڑھا تو وہ قید ہی میں تھے۔ عید سے پہلے میں نے ایک دن اماں جی سے کہا مجھے ریشمی کپڑے بنا دیجئے۔ غالباً کسی لڑکی کے دیکھ کر یا ویسے ہی کہے۔ انہوں نے صرف یہ جواب دیا کیا تمہیں معلوم نہیں تمہارے ابا جی قید ہیں؟ پھر بھلا کیا سوجھتا تھا۔ میں نے زندگی کا سب سے پہلا خط ابا جی ہی کے نام جیل میں لکھا۔ اماں جی نے پنسل سے کچا کر دیا اور میں نے اس پر قلم پھیر دیا۔ پھر مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل ہو گیا جس پیشی پر فیصلہ متوقع تھا۔ اس سے تین دن قبل اماں جی ہر رات مردانے میں اور کچھ خواتین کو بلا کر زنانے میں بھی آیہ کریمہ کا ختم کرواتی رہیں۔ شہر میں ایک صاحب تھے جو احرار کے جلسوں کی منادی تانگے میں نوبت بجا کر چوک در چوک کیا کرتے تھے۔ تیسرے دن عصر کے وقت عین ہماری بیٹھک کی کھڑکیوں کے سامنے تانگہ آ کر رکا اور ان صاحب نے دھڑا دھڑ نوبت بجانی شروع کی اور فرط مسرت سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ابا جی کی رہائی کا اعلان کیا۔ میں نوبت کی آواز سن کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ ابا جی کی رہائی کی خوش خبری سن کر بھاگتی ہوئی اماں جی کے پاس آئی وہ صحن اور دالان میں نہیں ملیں۔ میں کوٹھڑی میں گئی تو وہ مصلے پر سر بسجود تھیں۔ یہ سجدہ شکر تھا! منادی والا مبارک دے کر چلا گیا اور ہمسائیاں مبارک باد کہنے آنے لگیں اب انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں ہمارے ہمسایوں نے تو چراغاں کیا تھا خوشی میں۔ رات نو دس بجے کا وقت ہو گا ہم سب چھت پر سوئے تھے اچانک جو میری آنکھ کھلی تو ساتھ والی چارپائی پر اماں جی نہیں تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو "گھ" میں سے صحن کی روشنی اوپر آ رہی تھی ہڑبڑا کر اٹھی نیچے دیکھا تو بیٹھک میں سے روشنی اور آوازیں آ رہی تھیں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری اور بیٹھک میں پہنچ گئی۔ ابا جی، بھائی جان، ماموں جان اور ابا جی کے بچپن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رفیق جناب حافظ محمد سعید صاحب مرحوم و مغفور تشریف لا چکے تھے اور سامان رکھ رہے تھے۔ میں ابا جی سے لپٹ گئی اور میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

۵۳ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت میں جب ابا جی قید تھے تو کئی مہینوں کی کوشش کے بعد ملاقات کی اجازت ملی۔ تینوں چھوٹے بھائی عطاء المحسن، عطاء المومن، عطاء المھیمن اور میں ابوالکفیل کے ساتھ سکھر ابا جی سے ملنے گئے۔ ان کو تو جیل کے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی کہ "داماد اہل خانہ میں شامل نہیں" وہ باہر کھڑے رہے۔ ہم چاروں بہن بھائی جیل کے پھاٹک پر کھڑے تھے کہ سامنے ہشاش بشاش ابا جی آتے دکھائی دیئے۔ ابوالکفیل تو باہر کھڑے صرف مصافحہ ہی کر سکے۔ سنتری نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں ہی سیڑھیاں تھیں۔ ابا جی ہمارے ساتھ ہی اوپر آ گئے کمرے میں ایک لمبا میز اور کرسیاں رکھی تھیں ایک پر جیلر بیٹھ گیا ایک پر ابا جی اور باقی پر ہم۔ گھر کا حال احوال پوچھا بھائیوں سے تعلیم کا پوچھا۔ نصیحتیں کیں۔ ابا جی نے جیلر سے پوچھا کہ داماد کو ملاقات کی اجازت کیوں نہیں وہ کہنے لگا "داماد" کیا ہوتا ہے؟ عطاء المحسن سلمہ نے کہا "سَن ان لاء" تو پھر اس نے قانونی مجبوری بیان کی۔ پون گھنٹہ کے قریب ہم بیٹھے۔ حبس تپش، خراب آب و ہوا، ناقص غذا اور اسی قسم کی دیگر ابتلاؤں کے سبب صحت بہت دگرگوں تھی۔ بالخصوص چہرہ اور سینہ پھوڑوں پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر ابا جی نے اپنی کسی تکلیف کا ذکر تک نہیں فرمایا۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ہی سیڑھیاں اترے اور اتنی بات کہی کہ رات رک نا مت شاید آج ہی چاند ہو جائے۔ شعبان کی اس دن انتیس تھی نا۔ اور پھر ہم تو سلاخوں سے لگے انہیں جیل کے اندر جاتا دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اور رہ عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسافر پیچھے مڑ کر دیکھا بھی کب کرتے ہیں۔

ملتان میں حکماء اور نشتر کالج کے ڈاکٹروں کا ہر حیلہ جب ناکام ہو گیا تو ان کی خواہش پر ان کو گھر لے آئے پھر ان کے ہمدم دیرینہ جناب چچا شیخ حسام الدین صاحب رحمہ اللہ کے پرزور اصرار پر بادل نخواستہ اماں جی لاہور لے جانے پر راضی ہو گئیں۔ مولوی محمد اکرم صاحب مرحوم یکے از مالکان سلطان فونڈری کے ہاں قیام رہا مگر چند دن کے عارضی افاقہ کے بعد نقاہت پہلے سے بھی بڑھ گئی تو اماں جی سب کی مخالفت کے باوجود واپس گھر لے آئیں اور یہ ان کا ہم پر احسان عظیم تھا۔ ہم بہن بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لاہور کچھ ملتان۔ اس طرح ہم دم واپسیں تک ان کی خدمت میں اکٹھے حاضر رہے۔

لاہور سے واپس آنے پر طبیعت ہم سب کے اکٹھے ہونے سے بھی نسبتاً بہتر ہو گئی۔ لیکن یہ چراغ بجھنے سے پہلے لو کا اونچا ہونا تھا۔

وفات سے تقریباً بارہ تیرہ دن قبل غسل فرمایا۔ والدہ ماجدہ نے سر میں بادام روغن لگایا اور بڑے عرصے بعد اس دن سرمہ بھی لگایا۔ چہرہ اس دن ایسے روشن تھا جیسے بیمار ہیں ہی نہیں۔ غسل کے بعد نماز ظہر پڑھی۔ کچھ لیٹے پھر عصر و مغرب بھی ادا کیں مغرب کے بعد دلیہ کھایا اور عشاء کا وقت ہوتے ہی فرمایا نماز پڑھا دو۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئے کمزوری کی وجہ سے سردی محسوس کرتے تھے۔ برآمدے میں پلنگ تھا اور برآمدے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درے کے سامنے صحن میں بیٹھ کر میں اور اماں جی کھانا کھانے لگی تھیں کہ عزیزی عطاء المحسن سلمہ باہر سے آئے اور آتے ہی اباجی کی طرف بڑھے اور پوچھا اماں جی آج اباجی نہائے ہیں۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ محسن نے اباجی کا ماتھا چومنے کے لئے جیسے ہی منہ رکھا تڑپ کر بولا اباجی کو تو بخار ہے۔ ہم دونوں نے کہا کہ ابھی تو لٹایا ہے کچھ نہ تھا۔ جب آکر ماتھے کو ہاتھ لگایا تو تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اور یہ بخار ۲۱ اگست ۶۱ کو عصر و مغرب کے درمیان اس وقت اترا جب انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ضعف و نقاہت کی شدت کو دیکھتے ہوئے بھی کم از کم مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اباجی ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔ ہفتہ ۱۹ اگست کو میں ظہر پڑھ کر پڑھنے والی بچیوں کو قرآن مجید کا سبق دینے برآمدے میں آگئی؟ اماں جی عطاء المحسن، عطاء المومن سلمہ پاس بیٹھے تھے۔ اچانک جو میں نے مڑ کر دیکھا تو بھائی اور اماں جی آنسو بہا رہے تھے۔ میں متوحش سی ہو کر بڑے کمرے میں آئی تو اماں جی کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے آپ کی خدمت نہیں ہو سکی معاف کر دیجئے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹے تھے۔ پھر اماں جی نے کہا میں تو آپ کے سہارے ہر دکھ بھول گئی تھی (وطن چھوٹنا، املاک کی بربادی وغیرہ) آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دی۔ ۲۰ اگست کا دن ایسے ہی گزرا گفتگو موقوف تھی مگر آواز دینے پر پہچانتے بھی تھے اور دوا یا دودھ سوڈا جو بھی ہم دیتے تھوڑا سا پی لیتے۔ ۲۱ کو صبح "محسن" بجائے پاس بیٹھنے کے ایک طرف بیٹھ کر منزل پڑھنے لگا۔ مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے کہا آج اباجی کے لئے کوئی دوا نہیں لاتے کتنی طبیعت خراب ہے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگا "کی کرنی جے دوا" (کیا کرنی ہے دوا) قانونِ الٰہی سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی میرا ذہن اباجی کی موت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں دکھی سی ہو کر باہر آگئی۔ بھائی جان کے مدرسہ کے دس گیارہ طلباء کا کھانا پکایا گھر کے لئے سالن پکایا۔ ایک بجے کے قریب میں فارغ ہوئی تو اماں جی فرمانے لگیں آؤ! اپنے اباجی کے پاس بیٹھو اور دودھ سوڈا پلاؤ میں رات بھی نہیں سو سکی۔ تھوڑی دیر لیٹ لوں۔ میں پلنگ کے ساتھ لگی کرسی پر آبیٹھی اور آواز دی۔ اباجی تھوڑا سا دودھ سوڈا پی لیں۔ چمچہ منہ سے لگایا۔ انہوں نے پی لیا دو تین چمچے پینے کے بعد منہ بند کر لیا پھر میں نے کہا۔ اباجی پی لیں اور تو کچھ کھانا ہی نہیں تو چند چمچے اور پی لئے۔ اماں جی اور میں ظہر پڑھنے لگیں۔ میں پڑھ چکی تو بھائی کہنے لگے۔ بڑے حکیم صاحب آئے

ہیں پردہ کر لیں۔ اس وقت شدید بخار تھا ہم لوگ برف کے پانی کی پٹیاں ان کے ماتھے پر رکھ رہے تھے۔ میں اٹھ کر اندر تو آگئی پر طبیعت بے چین تھی۔ میں دراز میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ بڑے حکیم صاحب کو ان کے پاؤں کی طرف جھکتے دیکھا بعد میں پتہ چلا وہ کوئی چیز پاؤں سے لگا کر دیکھ رہے تھے کہ حرکت ہے یا نہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے تین آوازیں دیں شاہ جی! شاہ جی! شاہ جی! اور چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ شاہ جی بخار اتر گیا شاہ جی آرام آگیا۔ شاہ جی صحت ہو گئی! تب مجھے پتہ چلا محسن کیوں کہتا تھا "دوا کی کرنی جے" اور بجلی کی طرح یہ خبر پھیلنا شروع ہو گئی مفتی محمود صاحب، عبدالغفور انوری صاحب، حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب اور یکے بعد دیگرے کئی حضرات آنے لگے۔ بڑی مشکل تھی اندر بیٹھی رہیں اور وقت آخر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی پاس نہ بیٹھیں۔ پھر ہم چادریں لے کر پاس بیٹھ گئیں۔ سب قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ اور وہ باری باری زمزم منہ میں ڈال رہے تھے۔ ایک قطرہ بھی باہر نہیں بہا وہ سکون سے پی لیتے۔ چند سانسیں باقی تھیں کہ اماں جی نے متوجہ کیا کہ دیکھو زبان ذکر کر رہی ہے میں نے دیکھا جس اللہ نے ان کو اقلیم خطابت کا یکتا تاجدار بنایا اور جس کی دمی ہوئی قوت کو انہوں نے اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے بیان میں ختم کر دیا اسی کا نام لیتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور پھر بند کر لیں۔ میرے ابا جی! میرے پیارے ابا جی! اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

بڑے لوگ پہلے بھی ہوئے اور اللہ کو منظور ہے تو پھر بھی پیدا ہوتے رہیں گے مگر ہم نے ابا جی جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

ابا جی کے ایک مرید تھے۔ جالندھر کے حاجی غلام محمد صاحب تقسیم کے وقت جائیداد کی تباہی کا دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ حواس مختل ہو گئے۔ صحیح ہوں یاد دورے میں، آتے ہر روز تھے۔ ایک دن نماز فجر کے وقت ہی گلی میں چکر لگا رہے تھے اور نجانے کیا کچھ پڑھ رہے تھے ابا جی نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بلا کر پاس بٹھا لیا۔ سمجھایا، بجھایا، چائے بنوا کر لے گئے پلائی۔ وہ چلے گئے موسم خنکی آمیز تھا۔ سنا ہوا ہے بہار میں جنون تیز ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک مصرعہ آیا۔ "جنوں میں فصل بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے" تقریباً تیس برس بعد اگلے روز یہ مصرعہ یاد آیا اور ابا جی کی یاد میں چند اشعار موزوں ہو گئے۔

جنوں میں فصل بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خوں رلاتی ہے

حافظ علی بہادر خاں صاحب مرحوم و مغفور مدیر روزنامہ ہلال نو بمبئی ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں احرار کی جانب سے بمبئی کی صوبائی اسمبلی کے امیدوار تھے اور مسلم لیگی ورکروں نے ان کو مار پیٹ کر شدید زخمی کیا تھا۔ اور ایک تو قطعی یاد ہے شاید دوسرا پرچہ بھی ان کی ہمشیرہ نے گھر میں سائکلو سٹائل مشین پر چھاپ کر شائع کیا تھا۔ پورے ہندوستان میں ہلال نو واحد روزنامہ تھا جو احرار کی حمایت کرتا تھا۔ حافظ صاحب نے نجی طور پر ڈیکلریشن حاصل کیا تھا اور وہ کل ہند احرار کے نائب صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے احرار کی انتخابی مہم چلائی تھی۔ ایک ہفت روزہ افضل سہارنپور تھا جو راؤ محمد کامل خاں صاحب اکمل کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ پنجاب میں تو کوشش کے باوجود ڈیکلریشن ہی نہیں دیا گیا تھا۔

امرتسر سے بمبئی کے لئے ابا جی جس دن روانہ ہونے لگے۔ اسی دن پنجاب کے انتخابی حلقوں کے دورے سے تھکے ماندے گھر آئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ابا جی کپڑے بدل لیجئے۔ اس روز انہوں نے جامنی اور بینگنی کے بین بین رنگ کا کرتا اور تہبند پہن رکھا تھا۔ جو کورا لٹھا رنگ کر بنایا گیا تھا۔ نو عمری تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بمبئی کو "عروس البلاد" سنا ہوا تھا جی چاہتا تھا کہ ہمارے اباجی وہاں بہت اچھے کپڑے پہن کر جائیں! انہوں نے میری بات سن کر کپڑوں پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا میرے لئے تو سب سے اچھے یہی کپڑے ہیں۔ سعید لایا ہے۔ میری بیٹی ہو کر تم بھی یہ بات کہتی ہو۔ یہ سعید تھے بزرگ محترم و مرحوم جناب حافظ محمد سعید صاحب، پٹنہ کے کوچہ خانہ باغ گلی لنگر کے رہائشی اباجی کے بچپن کے ساتھی۔ رفیق حفظ، مخلص خیر خواہ، اباجی کا ننھیالی مکان جو دادی جی مرحومہ کو جہیز میں ملا تھا تنہا اولاد ہونے کے سبب اباجی ہی کی ملکیت تھا۔ وہ تو ۳۰ء کے بعد کبھی پٹنہ گئے نہیں۔ چچا سعید ہی جب تک ان کا بس چلا کرایہ داروں سے لڑ جھگڑ کر کرایہ وصول کرتے کبھی ملتا کبھی چھ ماہ تک کچھ نہ ملتا! ان کی معاشی بدحالی کے دور میں اباجی نے ان کو اچھرہ میں جناب میاں قمر الدین صاحب مرحوم خازن کل ہند مجلس احرار کے خاندانی مدرسہ جامعہ قسمیہ میں مدرس قرآن لگوا دیا تھا۔ جس دن اباجی سکندر حیات کے قائم کردہ کیس سے بری ہو کر گھر آئے چچا ساتھ تھے! تقسیم سے قبل گھریلو مجبوریوں کی بناء پر ملازمت چھوڑ گئے۔ خان گڑھ، (۱۹۴۸ء) ملتان تک ان کے خطوط برابر آیا کئے۔ میرے شاہ جی! اور پیارے شاہ جی حفظکم اللہ اور پتا نہیں کیا کیا دعائیں القاب لکھ کر خط شروع کرتے بڑا اچھا خط تھا سیدھی سطریں پھر حاشیہ دائیں ہاتھ چھوڑا ہوتا چند سطور ادھر پھر پشت پر۔ تقریبا بیس پچیس سطور کا خط ہوتا۔ سن یاد نہیں لیکن اباجی کی زندگی ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اباجی کے بچپن کے ایک اور ساتھی اور محلہ دار محمد اسماعیل بنگالی میاں نے اطلاع دی کہ آپ کے حافظ محمد سعید فوت ہو گئے ہیں۔ اباجی نے آہ سرد بھری اور

انا للہ وانا الیہ راجعون

پڑھ کر یاد ماضی میں کتنی دیر گم رہے۔

رحمہ اللہ

اباجی بچپن کی باتیں کرنے لگے۔ کہ شہر میں جتنے حافظ تھے ہم دونوں سب کی نقل اتارتے۔ مگر ایک حافظ اتنا بد آواز تھا کہ میں اس کی نقل نہ اتار سکا، سعید نے اتاری۔ اباجی ہی کی طرح سر پر پٹے رکھے ہوئے تھے۔ کھدر پہنتے تھے۔ اور کسی وقت اچانک آواز پر اباجی کی آواز کا شبہ ہو جاتا تھا۔

حافظ علی بہادر صاحب آخری دور میں ہفتہ وار دورِ جدید دہلی سے نکالتے رہے۔ اب وہ بھی وہاں جا چکے ہیں جہاں سے پلٹ کر کبھی کوئی نہ آیا۔

© rasailojaraid.com